R. No. 21[illegible]/07 Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت [illegible]

ٹیلی فون [illegible]
قیمت فی پرچہ [illegible] سالانہ [illegible]

جلد ۲۴ - نمبر ۳۰ | ایڈیٹر:- آل احمد سرور | ۸ اگست ۱۹۶۵ء

بیرونی ملکوں سے کتابوں کی درآمد میں کمی

دلی سے خبر ملی ہے کہ درآمد کی موجودہ پالیسی کے مطابق بیرونی ملکوں سے کتابوں اور رسالوں کی درآمد میں پچاس فی صدی کمی ہو جائے گی اور ایک اندازے کے مطابق بالآخر یہ کمی ۶۲٫۵ فی صدی بڑھے گی۔ یہ کمی اس لیے کی گئی ہے کہ فارن ایکس چینج بچایا جائے۔ اس لیے کچھ کمی تو سمجھ میں آتی ہے لیکن اس قدر کمی سے ملک کی ذہنی فضا پر جو اثر پڑے گا اس کا یا تو حکومت کو اندازہ نہیں ہے یا وہ اس اثر کی اہمیت کو محسوس نہیں کرتی۔ ہندوستانی زبانوں کی ترقی، علمی و ادبی معیاروں کی بلندی، اعلیٰ تعلیم، سائنسی تحقیق، اقتصادی اور تعمیری کاموں کے لیے ضروری ہے کہ معیاری کتابوں اور رسالوں کی درآمد پر کوئی پابندی نہ ہو۔ یہ دراصل پورے ملک کی فلاح و بہبود کا سوال ہے اور اس معاملے میں تمام دانش وروں، ادیبوں، سائنس دانوں اور معلموں کو احتجاج کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ہم سب کا فرض ہے کہ فارن ایکس چینج کم سے کم صرف کریں کیونکہ ملک اس وقت ایک اقتصادی بحران سے گزر رہا ہے لیکن یہ معنی نہیں کہ ہم بنیادی اور ضروری چیزوں میں کمی کر دیں۔ آزادی کے بعد ہمیں جدید ہندوستانی زبانوں کو ملک کی زندگی میں ان کا حق دلانا ہے اور انھیں تمام کاموں کے لیے استعمال کرنا ہے۔ اس مہم میں خاصا وقت لگے گا اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ہر شعبے میں بیرونی ملکوں کی جدید ترین تصانیف اور رسائل سے برابر استفادہ کرتے رہیں۔ اگر پابندی لگانی ہے تو سستے ادب پر لگانی چاہیے جس سے بازار پٹا پڑا ہے۔ ہمارے ملک میں ویسے ہی سستا ادب اور عاشقی اور چٹخارے کا ادب کیا کم ہے۔ پھر کیوں ہم باہر سے مرچ گرم مسالہ منگائیں۔ ہاں معیاری رسالوں اور کتابوں پر کسی قسم کی پابندی ہماری ذہنی اور علمی زندگی پر بہت برا اثر ڈالے گی۔

دراصل اس سلسلے میں یونی ورسٹیوں، ادبی اور سائنسی اداروں کو پرزور احتجاج کرنا چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ کتب فروشوں کے لائسنس میں ایسی کمی نہ ہو کہ وہ علمی و ادبی کتابیں نہ منگا سکیں۔ وہاں اس کے لیے مناسب اقدامات ضرور کیے جا سکتے ہیں کہ سستے ادب کی درآمد بالکل بند ہو جائے۔ امید ہے کہ اس سلسلے میں جدید ہندوستانی زبانوں کے ادیب پہل کریں گے۔ علم و ادب کا خاص نکتہ یہ ہے کہ اس میں دیواریں نہیں ہوتیں۔ ذہن کی بالیدگی کے لیے صرف دیسی نسخے کام کر سکتے ہیں۔ ہر چراغ ہمارا چراغ ہے اور اس کی روشنی ہماری روشنی ہے۔ امید ہے کہ وزارت مالیات اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرے گی۔

سیر بین

جولائی میں چند دن کشمیر میں گزرے۔ اس وادی رنگ و بو میں جو بھی وقت گزر جائے حاصل زندگی ہے۔ فطرت نے حسن دوسرے خطوں کو اس لیے دیا ہے کہ اسے نظر نہ لگے، مگر یہ بنا کشمیر کے لیے ہے۔ اب کے ہوائی جہاز سے سری نگر جانے کا

اس شمارے میں

---x---

اتفاق ہوا۔ بانہال کی بلندی کو پامال کرتے ہوئے جہاز جب کشمیر کی وادی میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ دنیا کی ساری بہاریں نہیں عجیب زن ہیں۔ چشمہ شاہی یا نشاط سے ڈل کا منظر دیکھیے تو جی چاہتا ہے کہ اسی کے ہو رہیے۔ نسیم باغ کی ٹھنڈی ہوا اکبر کے جاہ و جلال کے کتنے افسانے سناتی ہے۔ شالامار جہانگیر اور نور جہاں کی یاد ہی نہیں دلاتا، آج بھی وہاں کوئی نہ کوئی نور جہاں نظر آ جاتی ہے یہ اور بات ہے کہ اب جہانگیر پیدا نہیں ہوتے۔

لیکن جس نے پہلگام میں لدر کی شوخی اور طراری نہیں دیکھی اس نے اقبال کے ان اشعار کا صحیح لطف اٹھایا ہی نہیں ؎

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی　اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی

رُکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ　پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

لدر بہتا نہیں تڑپتا اور مچلتا ہے۔ اس کی موجوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اپنے ساتھ موجودہ تمدن کی ساری کدورتیں بہالے جائیں گی اور انسان کی روح کو پھر سے پاک صاف کر دیں گی۔ لدر کے کنارے تو اقبال کا خضر سوچتا ہے کہ ہمالہ کے چشمے کب ابلیں گے لدر میں ہمالہ کے چشمے ابل رہے ہیں اور کشمیر میں ایک نئی جنت بن رہی ہے۔

راقم الحروف کے نزدیک وہ پہاڑی مقام سب سے اچھا ہے جہاں بلندی پر برف پوش پہاڑ ہوں، چیڑ کے درخت قریب کی پہاڑیوں پر سایہ کیے ہوں۔ قدموں کے نیچے ندی کل کل کر رہی ہو اور فطرت کے اس حسن میں انسان کی شہری زندگی خلل انداز نہ ہو۔ یہ مکمل حسن پہلگام میں دیکھنے کو مل جاتا ہے۔

چالیس لاکھ سندھی بولنے والے اردو کی تائید میں

حیدر آباد (بذریعہ ڈاک) ڈاکٹر جیٹھا نند رائٹر داوی نے اپنے ایک بیان میں ہندوستان کے چالیس لاکھ سندھی بولنے والوں سے اپیل کی ہے کہ وہ ہندوستان کی اردو داں عوام کے لسانی مفادات کے تحفظ میں ان سے بھرپور تعاون کریں۔ اردو اور سندھی رسم الخط کی یکسانیت اور شباہت کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر جیٹھا نند نے کہا کہ اردو کے فروغ و ارتقاء سے سندھی کی ترویج و اشاعت میں بھی کافی مدد ملے گی۔ انھوں نے مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں سے اپیل کی ہے کہ وہ سرکاری مدارس میں اردو کی جماعتوں کے قیام کے تعلق سے غیر منصفانہ رویہ اختیار کرنے والے حکام کی سختی سے باز پرس کریں۔ ڈاکٹر جیٹھا نند نے ضلع پریشدوں، پنچایت سمیتیوں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اپنے تحت کے مدارس میں اردو جماعتوں کے قیام پر پوری توجہ دیں تاکہ اضلاع اور دور دراز افتادہ مواضعات میں رہنے والی اردو داں آبادی کو اپنے بچوں کی اردو میں تعلیم و تربیت کے تعلق سے کوئی شکایت پیدا نہ ہوگی۔ ڈاکٹر جیٹھا نند نے محبان اردو کو یقین دلایا کہ اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کی کسی بھی تحریک میں انھیں سندھی بولنے والوں کا اشتراک حاصل رہے گا۔ (سیاست کانپور)

تاجکستان میں غالب پر کتاب

تاشقند — ۲۸ جولائی تاجکستان اکیڈمی کے نوجوان محقق عبد اللہ غفوروف کی "مرزا غالب کی حیات اور شاعری" پر کتاب شائع ہو گئی ہے

مرزا غالب کے اردو اور فارسی کلام اور مرزا کی شخصیت سے روس میں دلچسپی برابر بڑھتی جا رہی ہے۔

عبد اللہ نے اپنی کتاب میں مرزا صاحب کی فارسی شاعری پر زیادہ زور دیا ہے۔ اور مرزا کی فارسی اشعار کے بھی نمونے پیش کیے ہیں۔

اپنی تحقیق کے سلسلے میں عبد اللہ ہندوستان بھی آ گئے تھے۔ اور انھوں نے غالبیات کے ماہرین سے بھی استفادہ کیا تھا۔

انھوں نے مرزا کا کلام دوسرے فارسی اور تاجک کے بڑے شاعروں کے مقابلے میں پیش کر کے موازنے کے ذریعہ بھی مرزا کو بہتر ثابت کیا ہے۔

روس میں مرزا غالب پر یہ پہلا وقیع کام ہوا ہے۔ (قومی آواز)

رائٹرز گلڈ پاکستان کے انعامات

پاکستان رائٹرز گلڈ نے اردو کی مندرجہ ذیل تصنیفات پر ۶۴-۱۹۶۳ء کے آدم جی اور داؤد جی ادبی انعامات دینے کا اعلان کیا ہے:۔

مصنف	صنف	تصنیف	انعام کی رقم
رشیدہ فصیح احمد	ناول	آبلہ پا	۵۰۰۰
عبد العزیز خالد	شاعری	تکار نشیط	۲۵۰۰
قتیل شفائی	شاعری	مطربہ	۲۵۰۰
جمیل جالبی	تحقیق	پاکستانی کلچر	۵۰۰۰
عندلیب شادانی	تحقیق	تحقیق کی روشنی میں	۵۰۰۰

(کتابی دنیا، کراچی)

ڈاکٹر وزیر آغا

اُردو کا مستقبل

(ادارے کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ اس موضوع پر اظہار خیال کی دعوت ہے۔ ادارہ)

اردو کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ بھارت میں تو اس کا مستقبل تاریک ہے لیکن پاکستان میں جہاں اسے ایک قومی زبان ہونے کا شرف حاصل ہے، اس کا مستقبل نہایت شاندار اور اس کی ترقی کے امکانات لامحدود ہیں۔ یہ خیال ایک بڑی حد تک غلط ہے۔ بے شک بھارت میں اردو کو تنگ نظری، تعصب اور حکومت کے غیر ہمدردانہ رویے کا سامنا کرنا پڑا ہے لیکن اردو کے چند ہی خواہوں نے اس صورتِ حال کا کچھ یوں مردانہ وار مقابلہ کیا ہے کہ آج بھارت کے طول و عرض میں اردو کی بقا کا مسئلہ قومی کلچر اور ہندوستانی روایات کی بقا کا مسئلہ بن گیا ہے۔ سخت ناساعد حالات میں اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لیے جس طرح اردو کے بہی خواہ اپنی عزت، جان اور مال کی قربانی دینے پر آمادہ ہیں، اس کی مثال آج سے قبل ہمارے سامنے نہیں آئی۔ لیکن پاکستان میں صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے!

آج بھارت میں اردو دشمنی کی ایک وجہ تو یہ خیال ہے کہ پاکستان نے اردو کو اپنا لیا ہے اور جس شے کو پاکستان اپنا لے، بھارت والوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے۔ دوسری وجہ یہ نظریہ ہے کہ اردو زبان عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے جو ہندوستانی بھاشاؤں سے قطعاً مختلف ہے۔ تیسری وجہ یہ خیال ہے کہ اردو کی بحیثیت زبان کوئی الگ حیثیت نہیں، بلکہ یہ صرف ہندی کی ایک شاخ ہے۔ آخری یہ کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے، ہندوؤں اور سکھوں کا اس سے کوئی واسطہ نہیں! آئیے ان سب باتوں پر ایک نظر ڈال کر آگے بڑھیں۔

یہ خیال کہ پاکستان نے اردو کو اپنا لیا ہے، کچھ ایسا صحیح نہیں۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستان کے ایک حصے یعنی مشرقی پاکستان میں اردو کی حالت قابلِ رحم ہے۔ وہاں قومی زبان بنگالی ہے اور اردو کے لیے بیشتر بنگالیوں کے دلوں میں کوئی احترام نہیں۔ میں جب اپنے کسی بھارتی دوست کو خط لکھتا ہوں تو ازراہِ احتیاط لفافے پر انگریزی میں بھی پتہ درج کرتا ہوں تاکہ میرا خط کسی متعصب ذہن کی نذر نہ ہو جائے تاہم اگر پتہ صرف اردو میں لکھوں تو بھی خط کے ضائع ہو جانے کا احتمال بہت کم ہے۔ لیکن جب میں مشرقی پاکستان میں کسی دوست کو خط لکھتا ہوں تو بڑے التزام سے پتہ صرف انگریزی میں لکھتا ہوں کیوں کہ تجربے نے مجھے بتایا ہے کہ وہاں اردو پتے والا خط مشکل ہی سے اپنا راستہ تلاش کر سکتا ہے۔ یہ ہے مشرقی پاکستان میں اردو زبان کا حال۔ اب مغربی پاکستان کی طرف آئیے! مغربی پاکستان میں صورتِ حال یہ ہے کہ پنجاب میں پنجابی، سندھ میں سندھی، سرحد میں پشتو اور بلوچستان میں بلوچی کے فروغ کے لیے سرتوڑ کوشش ہو رہی ہے اور یہ مطالبہ زور پکڑ رہا ہے کہ ابتدائی تعلیم اردو کے بجائے صوبائی بولیوں میں ہونی چاہیے۔ ابھی تک یہ مطالبہ منظور نہیں ہوا اور اس کی بڑی وجہ حکومت مغربی پاکستان کا تدبر اور دانشمندی ہے لیکن اگر خدانخواستہ یہ مطالبہ منظور ہو گیا تو پھر مغربی پاکستان میں بھی اردو کا وہی حشر ہو گا جو مشرقی پاکستان میں ہوا ہے۔ . . . . کاغذ پر اردو کو مغربی پاکستان کی قومی زبان تسلیم کیا گیا ہے لیکن دفتری زبان بدستور انگریزی ہے۔ اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دینے کے سلسلے میں کچھ کوششیں ضرور ہوئی ہیں لیکن صرف جذباتی سطح پر۔ انگریزی کا تسلط روز بروز بڑھ رہا ہے۔ دکانوں کے اکثر سائن بورڈ انگریزی میں ہیں۔ کار کی نمبر پلیٹ اگر اردو میں لکھی جائے تو کار کا چالان کر دیا جاتا ہے۔ عام تعلیم یافتہ طبقہ انگریزی میں بات کرنا پسند کرتا ہے اور اگر اردو میں بات کرتا ہے تو اس میں پچاس فی صد الفاظ انگریزی کے ہوتے ہیں۔ انگریزی زبان مہذب سوسائٹی اور تعلیمی معیار کی اتنی بڑی علامت بن گئی ہے کہ اب تو ہمارے یہاں مولوی صاحبان بھی اپنے مواعظ میں انگریزی الفاظ بے محابا استعمال کرنے لگے ہیں۔ حکومت کا خیال ہے کہ ۱۹۷۰ء کے بعد ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا جو اس بات کا جائزہ لے گا کہ اردو کو دفتری زبان کا درجہ ملنا چاہیے یا نہیں۔ اس وقت تک اردو پر انگریزی کا تسلط کچھ اور بڑھ چکا ہو گا اور مغربی علوم اتنے آگے جا چکے ہوں گے کہ اردو کے لیے ان کے قدموں سے قدم ملانا ایک امرِ محال ہو گا — یہ تو ہے پاکستان میں اردو کا حال۔ حیرت ہے کہ اس سب کے باوجود بھارت میں اردو دشمنی اس کارن ہے کہ پاکستان نے اردو کو اپنا لیا ہے۔

بھارت میں اردو رسم الخط کو ترک کرنے اور اردو کو ہندی کی ایک شاخ قرار دینے کی ساعی ایک دوسری سے منسلک ہیں۔ لیکن اردو ہندی کی شاخ ہرگز نہیں بلکہ ہندوستانی بھاشا کی ترقی یافتہ اور ترقی پذیر صورت ہے۔ گیارھویں صدی میں جب مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے تو انھیں جن دیسی بولیوں کا سامنا کرنا پڑا وہ لہجے کی تبدیلیوں کے باوجود ایک ہی عالمگیر بھاشا کے مختلف روپ تھیں۔ اس بھاشا کو مسلمانوں نے ہندوستان کی بنیادی بھاشا قرار دیا۔ جب کاروباری ضروریات کے تحت اس بھاشا میں فارسی اور عربی الفاظ کی بڑے پیمانے پر آمیزش ہوئی تو اس کی جو صورت نکھر کر سامنے آئی اسے ریختہ اور بعد ازاں

اردو کا ! م ملا چنانچہ اردو مسلمانوں کی زبان ہرگز نہیں تھی بلکہ ایک کاروباری ضرورت کے تحت ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ مساعی کا نتیجہ تھی۔ جس طرح قدیم زمانے میں دراوڑی زبانوں نے آریائی زبان ویدک کے الفاظ خود میں سمو لیے تھے اور ایک نئی زبان کے روپ میں ابھر آئی تھیں بعینہٖ بھاشا نے فارسی اور عربی الفاظ قبول کرنے کے بعد اردو کا روپ دھار لیا۔ گویا اردو، ہندوستانی بھاشا کی ترقی یافتہ صورت تھی اور جدید دور سے قبل کبھی کسی کو یہ خیال تک نہ آیا تھا کہ یہ محض ہندی اسلوب (شیلی) ہے۔ پھر ایک یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے موقعہ پر یہاں دیسی لپیاں رائج تھیں لیکن ایک وسیع ترلسانی اور ثقافتی میل جول نے جس ایک تیسری زبان یعنی اردو کو جنم دیا وہ اپنی بعض داخلی ضروریات کے تحت عربی رسم الخط اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی۔ بے شک فارسی زبان کو درباری زبان کا درجہ حاصل تھا اور اس لیے اس کے رسم الخط کے سلسلے میں بھی احکام کی تعمیل ضروری تھی لیکن اردو یا اردو کے ابتدائی روپ یعنی دکنی کے لیے عربی رسم الخط کی قبولیت کسی مجبوری کے تابع ہرگز نہیں تھی حقیقت یہ ہے کہ اردو کے اصل مزاج عربی رسم الخط کو اختیار کرنے ہی سے سامنے آتا ہے اور اس لیے محض رسم الخط کی بنا پر اردو کو مورد عتاب ٹھہرانا ایک بالکل غلط بات ہے۔

اردو کو بدیسی زبان قرار دینے کے سلسلے میں آخری وجہ پیش کی جاتی ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ اس سے زیادہ غلط بات اور کیا ہو سکتی ہے! نہ صرف یہ کہ اردو کی ابتدا اس کے سلسلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ مساعی ہمارے سامنے ہیں بلکہ اپنی ساخت اور مزاج کے اعتبار سے بھی اردو خالصتاً دیسی ہے۔ پھر اگر یہ واقعی صرف مسلمانوں کی زبان ہوتی تو ہندو اور سکھ حضرات اسے اتنے بڑے پیمانے پر اظہار ذات کا وسیلہ کیوں بناتے! جدید دور سے پہلے کے زمانے کو چھوڑیئے جس میں دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، تربھون ناتھ ہجر، جوالا پرشاد برق، چکبست، پریم چند، سورج نرائن مہر، پیارے لال شاکر، طالب بنارسی اور بے شمار دوسرے نام ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں بلکہ موجودہ دور کو دیکھو جس میں اردو کو نکھارنے اور فروغ دینے میں ہندو اور سکھ ادبا نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ میں ناموں کی فہرست مرتب کرنے کے حق میں نہیں ہوں لیکن اردو کو ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ثابت کرنے کے سلسلے میں مجھے ایک لمحہ کے لیے یہ عمل بھی گوارا ہے۔ سو دیکھیے کہ فراق گورکھپوری، کیفی محروم، آنند نرائن ملا، گوپی چند نارنگ، گیان چند جین، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، جگن ناتھ آزاد، موہن سنگھ دیوانہ، ست پرکاش شوق، اپندر ناتھ اشک، کنھیا لال کپور، رام لال، دیویندر ستیارتھی، دیوان سنگھ مفتون، بلونت سنگھ، برج کوپل فکر تونسوی، رامانند ساگر، کمار پاشی، ستیش بترہ، گوپال متل، کرشن موہن، کرشن ادیب، تخت سنگھ، امر سنگھ، مدھوسودن، جوش ملسیانی، عرش ملسیانی، مہندر ناتھ، پریم ناتھ در، مخمور جالندھری، ہیرانند سوز، م م راجندر، وشوا ناتھ درد، کیلاش ماہر، دیویندر اسر، رتن سنگھ، جوگندر پال، ہرنس سنگھ دوست، بلونت گارگی، کشمیری لال ذاکر، راجندر ناتھ شیدا، پریم وار برٹنی، شہردن کا ردریا، راج نرائن راز، بمل کرشن اشک، گوپی ناتھ امن، پریم ناتھ پردیسی، شمشیر سنگھ نرولا، رام پرکاش اشک، راج بلدیو راج، خوشتر گرامی، کرپال سنگھ بیدار، امریک سنگھ، مہندر پال، نریند لتھپال، ست پرکاش سنگر، مہندر سنگھ بیدی، ساحر ہوشیار پوری، اودے سنگھ شائق، ہری چند اختر، نریش کمار شاد، سرلا دیوی، کوشلیا اشک، دیا نرائن نگم، پرکاش پنڈت، کرتار سنگھ دگل اور لاتعداد دوسرے لکھنے والوں نے ہندی کے بجائے اردو ہی کو اظہار ذات کا وسیلہ بنایا ہے۔ کیا انھیں کوئی مجبوری تھی کہ وہ نہ صرف مسلمانوں کی زبان بلکہ اس کی لپی بھی اختیار کریں؟ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کے اندر کوئی شے تھی جو اپنے اظہار کے لیے انھیں اردو کی طرف راغب ہونے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس لیے بھی کہ اردو اسی دھرتی کی زبان ہے اور کسی ایک فرقے کی میراث نہیں!

اگر اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کے ایک بہت بڑے طبقے نے اسے کیوں ترک کر دیا؟ نیز مغربی پاکستان کے مختلف حصوں کے مسلمان کیوں اس سے بے اعتنائی برت رہے ہیں اور اس کی جگہ صوبائی بولیوں کو دینے کے متمنی ہیں؟ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں خود یہ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اردو دراصل "ہندوستان" کی زبان ہے اور اس لیے انھیں اس سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے۔ آج اردو زبان ایک عجیب سے دوراہے پر کھڑی ہے۔ بھارت کے بیشتر لوگ اس سے اس لیے نالاں ہیں کہ یہ پاکستان کی زبان ہے اور اہل پاکستان اس سے اس لیے متنفر ہیں کہ یہ بھارت والوں کی زبان ہے گ۔

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

ان دونوں نظریوں سے اگر تعصب، تنگ نظری اور غلط فہمیوں کو نکال دیا جائے تو پھر یہ نتیجہ مرتب ہوگا کہ ہندوستان اور پاکستان کی مشترکہ کاروباری زبان اردو اور صرف اردو ہے لیکن بدقسمتی سے دونوں ملک اس سے دست بردار ہو جانا چاہتے ہیں مسلمان جب ہندوستان میں وارد ہوئے تو ان کے لیے یہاں کی بھاشا کے مختلف رنگوں میں تمیز کرنا مشکل تھا (یہ بات انسانوں کے سلسلے میں بھی درست ہے کیونکہ سب گورے یا چینی جاپانی ایک جیسے ہی نظر آتے ہیں) اور اس لیے انھوں

(باقی صفحہ ۹ پر)

انحطاط

ک۔ پ۔ پرواز

سب سے پہلے جو کرن
دھرتی کے ماتھے پر پڑی تھی
اُس کرن کا رنگ زرد اتنا نہیں تھا
جس قدر ہے آج کے اتنے بڑے سورج کا پرتو
ٹھیک ایسے ہی ابد کا یہ مسافر
جو ازل کے روز کتنا سرخ رو تھا
ہر سحر کو شام کرتے کرتے ایسا ہو گیا ہے
اس کی شریانوں میں جیسے ایک بھی قطرہ لہو باقی نہیں ہے

نسیم صبح سے

کریم اسعدی

تابکے یہ گلشن فکر و نظر
یونہی پژمردہ رہے گا سربسر
جیسے ہو اوڑھے ردائے رنج و غم
یہ فضا یہ سایۂ تاریک تر
تیرگی سی ایک تا حد نظر
اے نسیم صبح اک جھونکا ادھر
غنچہ غنچہ مسکرا اٹھے کچھ اس انداز سے
ذرے ذرے پر ہو انجم کا گماں
ہر روش آئے نظر اک کہکشاں
گلشن فکر و نظر بن جائے رشک آسماں

یادیں

ایس۔ نورالحسن انور

بیکراں زندگی کی یادوں میں
پرخطر اور سیاہ راتوں میں
اپنی حالت پہ مسکراتا ہوں
میری مایوسیوں پہ اٹھلا کر
چاندنی مسکرانے لگتی ہے
عہد ماضی جو یاد آتا ہے
نیند میری اچٹنے لگتی ہے
مجھ کو قسمت سے بھی ہے شکوہ کچھ
اور زمانے سے کچھ گلا بھی ہے
ان حدوں سے گزر کے میں اکثر
سوچتا ہوں مرا خدا بھی ہے

جوش ملسیانی

میری زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ

(ہماری زبان کو زیادہ دلچسپ، عوام پسند اور مفید بنانے کے لیے "میری ادبی زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ" کے عنوان سے ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے جس میں اردو کے ممتاز اور صاحب طرز ادیبوں اور شاعروں کے مختصر مضامین شایع کیے جائیں گے۔ جوش ملسیانی صاحب کا مندرجہ ذیل مضمون اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ (ادارہ)

سنہ ۱۹۳۲ء یا شاید سنہ ۱۹۳۳ء کا ذکر ہے۔ میرٹھ میں ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا۔ میدان مشاعرہ کی آرائش و زیبائش میں بہت کچھ تکلف کیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید عروض نہیں، کوئی شاہی دربار ہے۔ بادشاہ بخیر سر رضا علی اس کے صدر تھے۔ بہت سے مشاہیر شعرا کو شرکت کی تکلیف دی گئی تھی بےخود دہلوی، نوح ناروی، جوش ملیح آبادی، مجاز لکھنوی، سیماب اکبرآبادی، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری اور حضرت صاحب شامل جلسہ تھے۔ جو میں جوش ملسیانی، تو جناب بیدی صاحب کے ساتھ ہر جگہ یعنی مقامی مشاعروں میں شامل ہوتے رہتے تھے انھیں ہمارے ارباب ادب جاننے کی طرح جانتے تھے مگر میں پہلی دفعہ ہی میرٹھ کے مشاعرے میں شامل ہوا تھا جب مجھے پڑھنے کے لیے وقت دیا گیا اور میں اسٹیج پر بیٹھ گیا۔ تو صدر مشاعرہ نے تقریر شروع کر دی۔ کہنے لگے کہ میں بیمار رہتا ہوں، اس لیے مشاعروں میں کم شامل ہوتا ہوں۔ صدر کی حیثیت سے کچھ بولنا پڑتا ہے اور زیادہ بولنے سے تکلیف بڑھتی ہے۔ اب یہ بزرگ آپ کے سامنے آئے ہیں اور مجھے بولنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس محفل پر مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ اپنے حواریوں کے ساتھ ایک جگہ بیٹھے تھے۔ پھرتے پھراتے اللہ میاں بھی وہاں آ نکلے۔ اللہ میاں کا نام تو سب نے سن رکھا تھا مگر ان کی صورت آشنا کوئی نہ تھے۔ اس لیے اللہ میاں کی شان کے مطابق آؤ بھگت نہ ہوئی۔ یہ رنگ دیکھ کر ایک صاحب نے اپنے رفیقوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ نے انھیں پہچانا نہیں۔ یہ وہ ہستی ہے جس نے زمین آسمان کو بنایا۔ یہ سن کر وہ لوگ کچھ زیادہ متوجہ ہو گئے۔ مگر پوری مدارات پھر بھی نہ ہوئی۔ یہ رنگ دیکھ وہی صاحب پھر بولے اور کہا، یہ وہ ہستی ہیں جس نے انسان کو بنایا۔ اس بات کو سن کر وہ لوگ پہلے سے زیادہ متوجہ ہو گئے اور خوش آمدید عرض کرنے لگے۔ مگر ان کی شان کے مطابق تعظیم و تکریم اب بھی نہیں تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے وہی صاحب پھر بول اٹھے اور کہا۔ آپ ان کو ابھی نہیں پہچانا یہ حضرت عیسیٰ کے باپ ہیں یہ الفاظ سن کر تمام حاضرین مودب ہو گئے۔ کوئی پاؤں دبانے لگا کوئی جوتے کی گرد جھاڑنے لگے۔ کسی نے کہا میرے سر پر بیٹھیے کسی نے کہا میری آنکھوں پر بیٹھیے۔ سو یہ بزرگ جو آپ کے سامنے آئے ہیں عرش کے باپ ہیں۔ یہ یکا یک شاعر بھی ہیں، ادیب بھی ہیں، نقاد بھی ہیں، اس سے زیادہ کچھ کہوں۔ تو شاید مسلمان اصحاب مجھ سے ناراض ہو جائیں۔ یہ لطیفہ اور تعارف سن کر مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ حاضرین بھی مسکرانے لگے اور پوری محفل شگفتہ نظر آنے لگی۔

میں حال پیش کر رہا ہوں مگر یہ عجیب تعارف مجھے اب تک نہیں بھولا۔

زیر چند پرشاد شگفتہ

وحشی کانپوری مرحوم

کرشن سہائے بھٹناگری نام وحشی تخلص وطن کانپور۔ والد کا نام منشی چندی سہائے تھا جو نگر پولیس میں سب انسپکٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ وحشی صاحب کی ولادت سمبت ۱۹۴۱ بکرمی میں ہوئی قوم کے شری واستو کایستھ تھے اور شہر فتح پور کے باشندے تھے آپ کے دادا منشی گنگا سہائے فتح پور میں اپنے وقت کے سربرآوردہ مختار عدالت تھے۔ آپ کے خاندان میں ہر شخص کو فارسی سے ذوق تھا اس لیے آپ کی ابتدائی تعلیم بھی فارسی میں ہوئی۔ ۱۳ تا ۱۴ سال کی عمر تک اس زبان کی شیرینی کے مزے آپ لیتے رہے اور کسی زبان کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ آپ چاہتے تھے کہ اردو کے مڈل کلاس میں داخل ہو جائیں لیکن اسکول میں کوئی آپ کو مڈل کلاس میں داخل کرنے کے لیے تیار نہ ہوا کیوں کہ آپ فارسی کے علاوہ کسی زبان کو نہیں جانتے تھے۔ بالآخر اس شرط پر داخل کر لیے گئے کہ اگر امتحان پاس کرنے کے قابل اس وقت تک سمجھے جائیں گے تو امتحان میں شریک ہو سکیں گے ورنہ نہیں۔ آپ کے امتحان کے ۹ ماہ باقی تھے اس درمیان میں آپ نے ارتھمیٹک اور دو مقالے اقلیدس کے مع مشقوں کے ختم کر ڈالے اور درجہ میں فرسٹ رہنے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ آپ مڈل کے امتحان میں نہ صرف اول آئے بلکہ ہر سبجیکٹ میں امتیازی حیثیت حاصل کی۔ اب آپ کا خیال ہوا کہ آپ تھوڑی بہت انگریزی پڑھ کر کسی اونچے درجہ میں نام لکھائیں۔ چھ مہینے میں انگریزی کے قواعد اور دو تین کتابیں پڑھ ڈالیں اور کچھ غلط سلط ترجمہ پریکٹیکل انگلش کی مدد سے کرنے لگے پھر ایک امتحان ششماہی میں ساتویں درجہ میں مڈل کلاس سے ایک درجہ نیچے آپ کا داخلہ ہو گیا۔ آپ کے انگریزی میں اور طلبا سے کم نمبر آئے مگر اور مضامین میں بہت زیادہ آئے اور آپ کا نام اس درجہ میں لکھ لیا گیا۔ اب آپ انگریزی محاورات اور اس کے استعمال سیکھنے میں دن رات صرف کرنے لگے اور مختلف کتابوں کے مطالعہ میں آپ کا وقت صرف ہونے لگا یہاں تک کہ تین سال کی مدت میں آپ نے اچھے ڈویژن میں انٹرنس پاس کر لیا اور کافی استعداد انگریزی میں حاصل کر لی۔ آپ کے والد پولیس میں سب انسپکٹر تھے لیکن کچھ برسوں کے بعد آپ کے والد پولیس کی ملازمت سے دل برداشتہ ہو گئے اور سبکدوشی حاصل کر کے خانہ نشینی اختیار کر لی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے تین بھائیوں کی تعلیم چار بہنوں کی شادی اور والدین کی پرورش کا سارا بار وحشی صاحب پر آ گیا اس لیے آپ کی تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا اور مجبوراً آپ کو ایک اسکول میں ماسٹری کر لینی پڑی اور باقی وقت پرائیویٹ ٹیوشن میں صرف کرنا پڑا۔ آپ کو قانون کے لیکچرس پورا کرنے تھے مگر قانون کے پڑھنے کا ہی موقع نہ ملتا تھا۔ ۱۹۰۷ء میں جب امتحان وکالت کے چھ مہینے رہ گئے تو سب کام چھوڑ چھاڑ کے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور کتب وکالت کا بغور مطالعہ کیا۔ پہلے ہی سال میں آپ وکالت کے امتحان میں پاس ہو گئے اور ۱۹۰۹ء سے آپ نے کانپور میں وکالت شروع کر دی اور ۱۹۲۳ء میں الہ آباد ہائی کورٹ کے ایڈووکیٹ بھی ہو گئے۔ ۱۹۲۲ء میں آپ کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا آپ اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکے لکھتے ہیں:

"جب میری زوجہ کا انتقال ہوا جس کا بیحد افسوس تھا میری حالت عجب کشمکش کی ہو گئی اس قدر لوگوں کی پرورش کا سارا بار مجھ پر تھا کہ ترک دنیا بھی نہیں کر سکتا تھا اور شدت غم کی وجہ سے زندہ رہنا بھی دشوار تھا جعفر علی خاں اثر نے مجھے مشورہ دیا کہ غم غلط کرنے کے لیے میں شاعری کو اپنا مونس تنہائی بناؤں"

اس طرح آپ کی شاعری کی ابتدا ہوئی سب سے پہلی غزل جو مشاعرہ میں ۱۹۲۴ء میں کانپور میں آپ نے پڑھی تھی اس کا یہ مطلع تھا۔

> روح نسیم آئینہ رخسار کون ہے
> کھلتا نہیں کہ رونق گلزار کون ہے

وحشی صاحب نے شعر و شاعری میں کسی سے مشورۂ سخن نہیں کیا آپ اپنے خود نوشت حالات میں رقمطراز ہیں:

"میری شان خودداری نے اجازت نہ دی کہ میں اپنے ناچیز کلام میں کسی دوسرے کے خیالات یا الفاظ کی آمیزش کر دوں"

۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۳ء تک کے اپنے کلام کو یکجا کر کے سودۂ عرفان کے نام سے مرتب کر لیا تھا لیکن اپنی حیات میں اس مجموعہ کو شایع نہ کر سکے۔ اس مجموعہ کلام کے علاوہ تین بیاضوں میں آپ کا کلام اور تھا۔

وحشی صاحب نے ۱۴ اگست ۱۹۶۰ء کو کانپور میں انتقال فرمایا۔ افسوس اس بات سے ہے کہ جس نے ساری زندگی اپنے خون جگر سے اردو کے گلستاں کو سینچا لیکن اردو کے کسی نقاد یا ادیب نے کوئی مقالہ ان کی یاد میں نہیں لکھا۔ مجموعہ کلام شائع کرانا ان کے ان دوستوں کا فرض ہے جو ساری زندگی ان کے مداح و معتقد رہے۔ وحشی صاحب کے بھانجے سید انند سنہا اردو کے استاذ غزل گو ہیں۔

وحشی کا شمار ہمارے اساتذۂ سخن میں ہے۔ غزل اور نظم دونوں میں یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ آپ کی غزلوں میں کوئی شعر ایسا نہیں ملے گا جس میں مجازی عریانی پائی جاتی ہو۔ اگرچہ تصوف سے آپ کو خاص ذوق تھا لیکن پھر بھی یہ کوشش کی ہے کہ تغزل کے رنگ میں خشک فلسفے کو بیان نہ کریں۔ غزلوں میں شگفتگی اور روانی ہر جگہ ملے گی اور اس کے ساتھ ساتھ دلکشی رنگینی اور شاعرانہ حسن سے ان کی تمام غزلیں بھرپور ہیں۔ حضرت جگر بریلوی "جدید تغزل" حصہ دوم میں آپ کی غزل کے سلسلے میں رقمطراز ہیں:۔

"آپ کی غزل میں غم و اندوہ کے مضامین ہونا لازمی ہیں۔ غم و اندوہ پر غالب آنے کے لیے آپ نے تصوف کا سہارا لیا۔ چنانچہ غزل میں بھی یہی رنگ ہے۔ عامیانہ اور سوقیانہ رنگ سے آپ دور رہے ہیں۔ کلام میں رفعت اور پاکیزگی ہے طرزِ ادا میں جوش اور آمد ہے جو تصوف کے مضامین سے مل کر کہیں کہیں مستانگی کا عالم پیدا کر دیتی ہے اس کے لیے فارسی الفاظ و تراکیب آپ کو بہت مدد دیتے ہیں۔ آپ کے اشعار غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں"

دورِ جدید کے چند منتخب ہندو شعرا میں عبد الشکور ایم اے صفحہ ۱۶ پر آپ کی غزل گوئی کے سلسلے میں فرماتے ہیں۔

"وحشی ایک بلند پایہ غزل گو بھی ہیں۔ ان کی غزلوں میں تغزل بدرجہ اتم موجود ہے بعض اشعار حقائقِ روزگار سے متعلق ہیں۔ تصوف کی ہلکی سی جھلک جگہ جگہ عیاں ہے زبان میں روانی اور سلاست موجود ہے مگر فارسی ترکیبوں سے اپنے کلام میں زور پیدا کرتے ہیں۔ ان کے کلام کے منتخب مفرد اشعار بھی ان کے مسلم الثبوت غزل گو ہونے کا ثبوت دیتے ہیں"

اڑائے پھرتی ہے سب کو ہوا زمانے کی
خبر کسی کو نہیں اپنے آشیانے کی

اے ذوقِ طلب سمجھوں کہ تکمیلِ جنوں سمجھوں
نزی صورت کا ہر ذرے پہ ہوتا ہے گماں مجھ کو
حقیقت میں وہی اس بحرِ ہستی کا شناور ہے
جو موجوں کا سہارا لے کے پھر موجوں سے باہر ہے

عشق اگر حسن کے پردہ میں نہ پنہاں ہوتا
دشت تو دشت ہے گلشن بھی بیاباں ہوتا

ہوش و خرد کا راہ جنوں میں گذر نہیں
یاں باخبر وہ ہے جسے اپنی خبر نہیں
ادراک کر لیا ہے وہاں عشق نے مجھے
احساس و وہم کا بھی جہاں پر گذر نہیں
دنیائے عشق کیں دلِ نا آشنائے غم
ایسی بھی ایک شام ہے جس کی سحر نہیں

اللہ رے پاسِ حسن کہ دیوانگی میں بھی
دستِ جنوں سے چاکِ گریباں نہ ہو سکا

ذرا یہ دیکھ کے پھولوں سے کھیلنے والے
انھیں نگاہوں میں پنہاں کوئی نوکِ خار نہ ہو

وہی ایک جلوۂ نور ہے کہ دمِ جبیں کا ظہور ہے
جو گھٹا تو دل کا سرور ہے جو بڑھا تو شعلۂ طور ہے

گھٹائیں اودی اودی میکدہ بر دوشِ فصلِ گل
نہ جانے لغزشِ توبہ ایمانوں پہ کیا گذری
تمنا ہے تو پوچھو جا کے یہ صحرا نوردوں سے
کہ وحشی کے نہ رہنے سے بیابانوں پہ کیا گذری

دہر کے لوگ جسے بےخبری کہتے ہیں
رندِ مشرب اُسے بالغ نظری کہتے ہیں
عمرِ فانی کی جھلک عہدِ جوانی تک ہے
لوگ پیری کو چراغِ سحری کہتے ہیں

کس سے پوچھیں نشانِ منزل کا
راہ میں گردِ کارواں بھی نہیں

یہ آبلے مرے دل کے فروغ پا نہ سکے
چراغِ شامِ غریباں تھے جھلملا نہ سکے
وہ کر سکیں گے بھلا کیا نظارۂ رخِ دوست
جو تابِ جلوۂ حسنِ نقاب لا نہ سکے

سلامِ شوق کا اپنے کہیں ملا نہ جواب
انھیں تو دیر و حرم میں بھی ہم پکار آئے

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

صفحہ ۴ سے آگے

نے یہاں کی مختلف بولیوں کی مشترکہ صفات کو ملحوظ رکھ کر یہاں کی اصل زبان کو ہندی بھاشا کا نام دیا تھا۔ یہی بھاشا عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش کے بعد اردو کہلائی۔ فی الواقعہ اردو کسی خاص علاقے یا گروہ کی زبان نہیں بلکہ ہندوستان اور پاکستان کی مختلف اور متعدد بولیوں کی مشترکہ صفات کی امین اور داعی ہے اور اسی لیے یہ ہندوستان اور پاکستان کے طول و عرض میں عام طور سے بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ مسلمانوں کے بعد جب انگریز اس دیس میں آیا تو مسلمانوں کی طرح اس نے بھی یہاں کی "بھاشا" کو فی الفور دریافت کر لیا تھا اور فورٹ ولیم کالج کے ذریعے اپنے ملازمین کو یہی بھاشا یعنی اردو سکھانے کی کوشش کی تھی۔

لیکن اردو صرف ہندوستان اور پاکستان تک محدود نہیں بلکہ پورٹ سعید سے لے کر ہانگ کانگ تک تمام بندرگاہوں پر عام طور سے بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اردو دراصل ایک کاروباری زبان ہے اور مختلف بولیوں اور زبانوں کے درمیان "مڈل مین" کے فرائض سرانجام دیتی ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد مرحوم، باری علیگ کے حوالے سے یہ قصہ سنایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ سنگاپور کے ایک چینی ہوٹل میں ایک چینی آیا اور بیٹھتے ہی اردو میں پکارا۔ "چائے لاؤ میٹھا کمتی"۔ استفسار کرنے پر اس نے بتایا کہ وہ چین کے شمالی علاقے کا رہنے والا ہے اور اس ہوٹل کا مالک جنوبی چین کا باشندہ ہے اور اس لیے یہ دونوں ایک دوسرے کی زبان سے ناآشنا ہیں۔ ایسے موقع پر اردو ہی ان کی نجات کا واحد ذریعہ ہے۔

اردو زبان نے تاریخ کے ایک اہم سنگ میل پر جنم لیا تھا یعنی جب زمانۂ جدید (Modern Age) کے ہر طرف اختلاط اور آمیزش کی ابتدا ہوئی تو اردو زبان اس نئی صورتحال سے عہدہ برا ہونے کے لیے وجود میں آئی تھی۔ اسی لیے یہ زبان دراصل مختلف زبانوں اور بولیوں کے الفاظ سے مل کر مرتب ہوئی اور اسے ریختہ کا نام ملا۔ اس زمانے سے لے کر آج تک اختلاط اور آمیزش کا رجحان بین الاقوامی سطح پر بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ فاصلے کم ہو گئے ہیں اور مختلف ممالک کے باشندے لاکھوں کی تعداد میں ایک دوسرے سے ملنے لگے ہیں۔ بین الاقوامی الفاظ از قسم سپوتنک، سٹلائٹ، راکٹ وغیرہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دنیا کے دور دراز گوشوں تک پہنچ جاتے ہیں اور وہ دن دور نہیں جب اس کرۂ ارض کی مشترکہ ایک بین الاقوامی زبان وجود میں آ جائے گی کہ بدلتے ہوئے حالات کا تقاضا بھی ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ آنے والے دور کی یہ بین الاقوامی زبان "ریختہ" ہوگی اور ان ہی لسانی بنیادوں پر مرتب ہوگی جن پر اردو مرتب ہوئی تھی۔ فی الاصل اردو اس کرۂ ارض کی جدید ترین زبان ہے اور اس میں بین الاقوامی ضروریات سے عہدہ برا ہونے کی تمام صفات موجود ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ایک ایسے موقع پر جب اردو کی بین الاقوامی حیثیت نمایاں ہو سکتی تھی اور مستقبل کی بین الاقوامی زبان پر اردو کے گہرے اثرات مرتسم ہو سکتے تھے، خود اس زبان کے بولنے والے اس کے بیری ہو گئے اور انھوں نے اسے حرف غلط کی طرح مٹانے کا تہیہ کر لیا۔ اپنی زبان سے بدسلوکی کی اس سے زیادہ افسوسناک مثال شاید ہی کبھی سامنے آئی ہو؟

صفحہ ۷ سے آگے

میں شریک بزم ہستی ہو گیا بدنام بھی
بزم برہم ہو گئی آیا نہ مجھ تک جام بھی

اللہ رے تیرے رُخ پہ حجابات تجلی
الجھی ہوئی اب تک انھیں پردوں میں نظر ہے

یوں ترنم ریز ہے ہر پردہ دل کے ساز کا
ہر نفس پر مجھ کو دھوکا ہے تری آواز کا
اک تجلی ہی تجلی ہر طرف پاتا ہوں میں
اللہ اللہ کیا اثر ہے حسن کے اعجاز کا

وطن کی یاد سے غربت میں سوگوار رہے
چھٹے عدم سے تو ہستی میں اشکبار آئے

اپنی ہمت اپنی نظریں اپنا اپنا انتخاب
ہے محبت خود پہ پرواز بھی اور دام بھی

انجمن ترقی گوالیار کے جلسہ عام میں

پنڈت سندرلال کی تقریر

انجمن ترقی اردو گوالیار کی جانب سے ایک جلسۂ عام زیر صدارت جناب نوتن کمار تیلنگ، ڈی۔ ایس۔ پی گوالیار ریجن مورخہ ۱۳ ار جولائی منعقد ہوا۔

جناب موتی لال شرما نائب صدر انجمن نے پنڈت سندرلال کا تعارف کرایا اور انجمن کے جنرل سکریٹری ذکار سید لیقی نے انجمن کی کارروائیوں اور پروگرام کی مختصر رپورٹ پیش کی۔

پنڈت سندرلال نائب صدر مرکزی انجمن ترقی اردو نے ہندستان کے موجودہ لسانی مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا "زبان کوئی قابل پرستش دیوی نہیں صرف اظہار خیال کا ایک ذریعہ ہے۔ نہ وہ ایک ٹوپی ہے جو سر پر اوڑھ لی جائے بلکہ پاؤں کی جوتی ہے جو اپنی سہولت اور آسانی کے مطابق پہن لی جائے اور کاٹے تو اتار دی جائے۔"

جنگِ آزادی کے دوران اردو شاعری نے ہندستانی زبانوں میں سب سے اہم رول ادا کیا اور اردو شعراء کی نظموں نے تحریک کو بیحد متاثر کیا۔ آپ نے حالی کی نظم "حب وطن" اور اقبال کی نظم "سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا" کے بہت سے اشعار سناتے ہوئے کہا کہ ان سے بہتر حب الوطنی کی مثالیں اور نہیں مل سکتی۔

پنڈت سندرلال نے ہندی پرست حضرات کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ہندی کو دشوار ترین بنانے سے کام نہیں چلے گا، اپنے اظہار خیال کے لیے اسے آسان سے آسان بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جو لوگ اردو رسم الخط کو تبدیل کرنے کی بات کرتے ہیں وہ لوگ قومی یکجہتی کے مخالف اور تنگ نظر ہیں۔ انھوں نے سوویت روس، امریکہ اور سوئزرلینڈ جیسے ممالک کی مثال دیتے ہوئے کہا ہمیں زبان کے مسئلہ میں ان ممالک سے سبق حاصل کرنا چاہیے، جہاں کئی کئی زبانیں سرکاری زبان کا درجہ رکھتی ہیں۔

جنوبی ہند میں زبان کے مسئلہ کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے راج گوپال آچاریہ سے اپنی گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ میرے اس سوال پر کہ انھوں نے ہندی کی مخالفت کیوں شروع کردی جب کہ وہ ہندی کے کٹر حامیوں میں سے ایک تھے تب راجہ جی نے جواب دیتے ہوئے کہا "ہندی والے اردو جیسی ہندی سے قریب ترین زبان کو نہیں گوارا کرسکے تو تامل اور جنوبی ہند کی دوسری زبانوں کو کیسے برداشت کرلیں گے۔

آپ نے ہندی کے حامیوں سے اپیل کی کہ جب تک وہ زبان کے معاملہ میں "جیو اور جینے دو" کا اصول نہیں اپنائیں گے اس وقت تک ملک میں اتحاد اور قومی یکجہتی کا تصور بےمعنی رہے گا۔

اخیر میں انھوں نے اردو کے حامیوں کو متنبہ کیا کہ صرف زبانی اور کاغذی کارروائیوں سے کام نہیں چلے گا بلکہ اردو کو اس کا جائز حق دلانے کے لیے انھیں عملی جدوجہد اور بڑی سے بڑی قربانی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

اسلام الدین قریشی
(سکریٹری انجمن ترقی اردو گوالیار)

بھاگلپور انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ کا اجلاس

ڈویژنل سطح پر اردو کنونشن کے انعقاد کا فیصلہ

۱۸ ار جولائی ۱۹۶۵ء کو بہ مکان ڈاکٹر محمد یونس صاحب ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔ زیر صدارت ڈاکٹر صاحب موصوف انجمن ترقی اردو بھاگلپور کا غیر معمولی اجلاس منعقد ہوا جس میں مختلف اہم تجاویز پاس ہوئیں۔

سب سے پہلے سابق جنرل سکریٹری اور نائب سکریٹری کی مستقل غیر حاضری کی وجہ سے انجمن کے جنرل سکریٹری کے لیے مولانا سید شاہ شرف عالم صاحب ندوی نامزد کیے گئے اور مزید ایک نائب سکریٹری کے لیے جنرل سکریٹری کو اختیار دیا گیا کہ وہ اپنی صوابدید سے کسی مناسب شخصیت کو منتخب کریں۔

اجلاس نے متفقہ طور پر طے کیا کہ ماہ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں ڈویژنل سطح پر اردو کنونشن منعقد کیا جائے جس کے لیے ریاستی انجمن اور اس کے واسطے سے متعلقہ اضلاع کی انجمنوں سے رابطہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا امید ہے کہ عنقریب ہی متعلقہ اضلاع کی انجمنوں کی ایک مشترکہ نشست بلائی جائے جس میں کنونشن کے متعلق امور پر غور و فکر کیا جائے گا۔

مجلس عاملہ نے اردو کی بقا و ترقی کے لیے ایک تجویز پاس کی کہ ایسے یونیورسٹی سطح کے تعلیمی ادارے جن کے انتظامیہ کمیٹیوں میں ہمدردانِ اردو کو دخل و رسوخ ہے وہ کوشش کریں کہ ان میں انہی طلباء کا داخلہ لیا جائے جو ثانوی یا اعلیٰ ثانوی امتحانوں میں اردو سبجیکٹ میں بھی کامیاب ہوئے ہوں یا کم از کم ایسے طلباء کو داخلہ میں ترجیح دی جائے۔

انجمن ترقی اردو کلٹی کا تعزیتی جلسہ

مورخہ ۱۲ ار جولائی ۱۹۶۵ء انجمن ترقی اردو کلٹی کی جانب سے ایک تعزیتی جلسہ زیر صدارت ایس۔ پی۔ داس گپتا، ایم پی کلٹی

درکس منعقد ہوا جس میں حسب ذیل تجویز آنجہانی سردار دیا سنگھ واسو کی وفات پر منظور کی گئی:۔

"انجمن ترقی اردو کلکتی کے صدر سورگیہ جناب سردار دیا سنگھ واسو طویل عرصہ تک علیل رہنے کے بعد مورخہ ۱۰ رجولائی کی شام کو اچانک اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ آنجہانی اردو کے زبردست حامی رہے، اس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ زندگی کے آخری لمحہ تک انجمن کے صدر کی حیثیت سے اردو کے کاز کو آگے بڑھانے کی کوشش میں ہمہ وقت مصروف رہے۔ لیکن افسوس کہ آپ اپنے ہزاروں اردو دوستوں کو سوگوار چھوڑ کر موت سے ہم آغوش ہو گئے جس سے مقامی طور پر اردو کے کاز کو کافی نقصان پہنچا۔ سورگیہ پرانے زمانے کی یادگار تھے اور اپنی روایات کو آخری دم تک باقی رکھا۔ ان اوصاف کے پیش نظر انجمن ترقی اردو کلکتی کا یہ جلسہ اپنے سورگیہ صدر کی موت پر اپنے دلی رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے ان کے پسماندگان کے ساتھ اپنی دلی ہمدردی کو پیش کرتا ہے۔"

(سکریٹری انجمن ترقی اردو شاخ کلکتی)

انجمن ترقی اردو بیرون دلی کی افتتاحی نشست

انجمن ترقی اردو (ضلع شاخ) بیرون دلی کی [illegible] کی افتتاحی نشست مورخہ ۴ رجولائی ۱۹۶۵ء بوقت ۶ بجے شام بلڈنگ سردار ہرپرت سنگھ، پنڈی جیولرز، کرشن نگر زیر صدارت جناب شیام دت بھاردواج منعقد ہوئی۔

سب سے پہلے انتظامیہ کمیٹی کے ممبران اور سرپرستوں کا گروپ فوٹو لیا گیا۔ حاضرین کی چائے وغیرہ سے تواضع کی گئی۔ معزز میزبان آخر تک تندہی سے مدعوین کی خاطر تواضع کرتے رہے۔

جناب نند لال صاحب پروانہ صدر انجمن ہذا نے گذشتہ اور گذشتہ سے پیوستہ انجمن کی جملہ کارگزاریوں سے روشناس کرایا اور یہ بتایا کہ درخواستیں وصول کی کہ اب تک پانچسو کے قریب ممبر بن چکے ہیں۔ انجمن کی ماہانہ نشستوں کے سلسلہ میں لائحہ عمل طے کیا۔ بعد ازاں قدیر احمد صاحب نائب صدر انجمن ہذا نے انجمن کی طرف سے ایک لائبریری کی ضرورت کا اظہار کیا جسے بالاتفاق رائے منظور کیا گیا اور قدیر احمد صاحب کی زیر سرکردگی آٹھ ممبران پر مشتمل ایک کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ جناب مہیش چندر نقش، جناب نند لال پروانہ، جناب فاروق ارگلی، جناب ایس ڈی بھاردواج، ڈاکٹر ہری کرشن، جناب بی ایل چندن، جناب ایس۔ پی نشتر اور جناب قدیر احمد صاحب نے لائبریری کے لیے کتابیں مرحمت فرمانے کا وعدہ کیا۔

بعدہٗ ایک مختصر محفل مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا جس میں جناب جگدیش چندر دھون، شری درشن لال زخمی، شری ایس۔ پی نشتر، شری ساحر سانگوی، لالہ جے نارائن سکون، لالہ ہرسرن داس خرد، شری بی ایل چندن، شری مہیش چندر نقش، شری نند لال پروانہ، شری قدیر احمد ایم۔ اے، شری چاندی رام سرور اور صاحب صدر نے اپنے کلام بلاغت نظام سے حاضرین کو محظوظ فرمایا۔ دوسرا دور بھی کامیاب رہا۔ قدیر احمد صاحب نے بحسن وخوبی اناؤنسر کے فرائض انجام دیے۔ آخر میں شری بی۔ ایل چندن جنرل سکریٹری نے اس کامیاب ترین نشست کے لیے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(قدیر احمد)

رجسٹرار جامعہ اردو کا بیان

علی گڑھ ۱۵ رجولائی۔ رجسٹرار صاحب جامعہ اردو، ہائی اسکول اور انٹر ڈگری کالج کے ہیڈ ماسٹر اور پرنسپل صاحبان کو اس امر کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ اگر ان کے شہر میں جامعہ اردو کے مراکز امتحانات نہیں ہیں تو وہ ان کے قیام کی طرف خصوصی اور فوری توجہ دیں تاکہ اردو کی ترویج واشاعت میں ان کا بھرپور تعاون حاصل ہو سکے اور مقامی طلبہ کے لیے جامعہ اردو کے امتحان میں شرکت کے لیے آسانیاں پیدا ہو سکیں۔

جامعہ اردو کے امتحانات کی افادیت اور ان امتحانات کے لیے حاصل شدہ مراعات کے سلسلہ میں تمام اطلاعات ہیڈ ماسٹر صاحبان اور پرنسپل صاحبان کے مطالبہ پر فوراً ان کی خدمت میں ارسال کر دی جائیں گی۔ امتحانات میں شرکت کے لیے فارموں کے داخلہ کی تاریخ بہت قریب ہے اس لیے فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

(برائے رجسٹرار)

انجمن تعمیر اردو کی ایک ادبی نشست

دلّی ۲۶ رجولائی۔ انجمن تعمیر اردو کے زیر اہتمام اردو ہال اردو بازار میں ہفتہ وار ادبی نشست منعقد ہوئی۔ جناب منشی عبد القدیر صاحب نے صدارت فرمائی۔ گذشتہ نشست کی کارروائی کی تصدیق کے بعد کچھ شعراء نے اپنا کلام سنایا۔

بعد ازاں جناب حکیم عبد السلام نظامی دہلوی عرف دادا خضر جی نے "حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی مرحوم کی حیثیت" پر شاندار کردار نگاری اور خاکہ نویسی کا شاہکار مضمون پیش کیا جس میں حضرت خواجہ صاحب مرحوم کی رواداری اور شخصیت کی پرتاثیر تصویر کشی کی گئی تھی۔

آپ کے بعد جناب ڈاکٹر محمد حسن صاحب ریڈر شعبۂ اردو دلّی یونیورسٹی نے لکھنؤ کی ۲۰ سالہ ادبی شخصیات اور ادبی صحبتیں کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا جس میں ۱۹۴۰ء سے تا حال لکھنؤ کے ادبی حالات بالخصوص علی سردار جعفری۔ اسرار الحق مجاز۔ علی جواد زیدی۔ سلام مچھلی شہری۔ محمود الظفر۔ ڈاکٹر رشید جہاں۔ ن۔م۔ راشد۔ میراجی۔ آل حسن۔ نصیر حیدر کا تذکرہ کیا، پرانے لوگوں میں حضرت یاس یگانہ چنگیزی اور پنڈت کشن پرشاد کول اور ممتاز حسین جونپوری سے ملاقاتوں کا حال بیان کیا۔

(نگراں ادبی سیکریٹری)

ودربھ میں انجمن ترقی اردو کی شاخیں قائم کیجیے

انجمن ترقی اردو (ہند) مہاراشٹر نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ علاقہ مرہٹواڑہ اور بمبئی عظمیٰ کی طرح ودربھ میں بھی، ہر شہر، ہر قصبہ اور ہر گاؤں میں، جہاں بھی اردو لکھنے، بولنے اور سمجھنے والوں کی قابلِ لحاظ آبادی موجود ہو، انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کی جائے لہٰذا ہم علاقہ ودربھ کے اسکولس کے پرنسپل صاحبان، اردو کے اساتذہ اور علم دوست حضرات سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ جلد از جلد اپنے علاقے میں انجمن کی شاخ قائم کریں تاکہ ریاستی شاخ اردو کے سلسلے میں کوئی ٹھوس قدم اٹھا سکے۔ مقامی شاخوں کے لیے آئین و دیگر ضروری کاغذات مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ، بمبئی نمبر ۳ سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

م۔ ی۔ کھتری
(شعبۂ نشر و اشاعت انجمن ترقی اردو (ہند) مہاراشٹر)

ضلع بدایوں کا نام بھی اردو کے اضلاع میں شامل کیا جائے

بدایوں، ۲۵ جولائی انفارمیشن افسر لکھنؤ کے اس پریس نوٹ کو دیکھ کر جس میں اردو کے اضلاع کی فہرست پیش کی گئی ہے بدایوں کے اردو داں طبقہ کو زبردست مایوسی ہوئی ہے کیونکہ اس فہرست میں ضلع بدایوں کا نام شامل نہیں ہے، حالانکہ ضلع بدایوں کے پندرہ فیصدی سے زیادہ لوگ اردو بولتے ہیں اور ان کی مادری زبان صرف اردو ہے۔ تقسیم ملک سے قبل یہاں تمام سرکاری و غیر سرکاری دفاتر میں اردو کو فوقیت حاصل تھی۔ اور اب بھی مقامی میونسپل بورڈ کی دوسری زبان اردو ہے۔ اس کے علاوہ بدایوں میں اب بھی اردو کے رسائل و جرائد اور اردو کے ادبا و شعرا کی تعداد دوسرے ضلع سے کم نہیں ہے۔ بدایوں نے ریاستی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ ضلع بدایوں کو بھی اردو کے اضلاع میں شامل کیا جائے۔

بدایوں کے اردو داں طبقے نے ضلع کے ممبران اسمبلی و پارلیمنٹ سے بھی مطالبہ کیا ہے کہ وہ ضلع بدایوں کا نام اردو کے اضلاع میں شامل کرانے میں ان کا ساتھ دیں تاکہ اس ضلع کے عوام بھی اردو کے اضلاع کو دی گئی مراعات سے فائدہ اٹھا سکیں۔

(سیاست کانپور)

صفحہ ۱۲ سے آگے

رفقائے کار کا جذبۂ ایثار کام آیا اور اس نے جامعہ کی گرتی ہوئی عمارت کو سنبھال لیا ورنہ بہت ممکن تھا کہ ہم آزاد تعلیم کی اس عظیم تجربہ گاہ سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتے۔ اس واقعے میں ہمارے لیے بڑا سرمایۂ عبرت پوشیدہ ہے۔ یہ واقعہ نشان دہی کرتا ہے کہ تعلیمی ادارے سیاسی رست خیز اور جذباتی ہیجان سے نہیں چلتے ہیں، انھیں چلانے کے لیے جذبۂ خدمت اور پرسکون فضا کی ضرورت ہوتی ہے۔ خدمت کا یہ جذبہ ہماری تحریک آزادی نے بہت سے دلوں میں پیدا کر دیا تھا لیکن آج اس جذبے کا بالعموم فقدان ہے اور جو لوگ اس کی کمی سستی نعرے بازی سے پوری کرنا چاہتے ہیں وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی گمراہی میں مبتلا کرتے ہیں۔

کتاب میں ایک خامی بری طرح کھٹکتی ہے۔ بعض غیر اہم واقعات کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور ان کے لیے کتاب کے ضرورت سے زیادہ صفحات وقف کیے گئے ہیں۔ کس سال جامعہ میں کون کون مہمان آئے یا کون کون سے ڈرامے کھیلے گئے، ان ڈراموں کے لیے اسٹیج کیسے ترتیب دیا گیا، فرنیچر کہاں سے مہیا کیا گیا اور اداکاری کے فرائض کن طالب علموں یا استادوں نے انجام دیے یہ باتیں ممکن ہے کسی ادارے کی سالانہ رپورٹ کا حصہ بن سکیں لیکن ایک مستقل تالیف میں ان کا اس شرح و بسط سے ذکر اس کی دلچسپی کم کر دیتا ہے اور وہ محض واقعات کی کھتونی بن کر رہ جاتی ہے۔ کتاب کی زبان سادہ اور دل نشین ہے اور یہ اس کا بڑا وصف ہے۔

تبصرہ

ریاض الرحمن شروانی

جامعہ کی کہانی

مؤلف:- عبدالغفار مدھولی
ملنے کا پتہ:- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی
ضخامت تقریباً ۵۰۰ صفحات قیمت ۱۶ روپے

جامعہ کی کہانی دراصل عزم و حوصلہ، خود داری و بلند ہمتی، استقلال و استقامت، دیدہ وری و دور اندیشی، دردمندی و شیفتگی اور سب سے بڑھ کر ایثار و قربانی کی کہانی ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام جن حالات میں عمل میں آیا، اس کے بانیوں کے پیش نظر جو اعلیٰ مقاصد تھے اور ان مقاصد کے حصول کا جو طریقۂ کار انھوں نے متعین کیا تھا ان سے ہم سب تھوڑے بہت واقف ہیں لیکن اس اجمال کی تفصیل بہت کم لوگوں کے علم میں ہے۔ عبدالغفار مدھولی صاحب نے، جو جامعہ کے استادوں کے مدرسے میں معلم ہیں، جامعہ کے قیام سے حصولِ آزادی تک جامعہ کی کہانی لکھ کر یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ بانیانِ جامعہ کے پیش نظر کون سی منزل تھی اور جو حضرات اس منزل کے راہ نورد بنے انھوں نے یہ ہفت خواں کیسے طے کیا۔ اس کتاب میں جہاں ایک طرف روشنی کے تاریکی پر غلبہ پانے کی داستان درج ہے، وہاں دوسری طرف ایسے موقع بھی آتے ہیں جب محسوس ہوتا ہے کہ عزم و حوصلے کی شمع کافوری حالات کی اندھیاری کا مقابلہ نہیں کر سکے گی، اور کسی وقت بھی بادِ مخالف کا ایک تند و تیز جھونکا اسے بجھا کر رکھ دے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ بالآخر تاریکی چھٹ گئی اور روشنی پھیل گئی اور جو بیج ۱۹۲۰ء میں مولانا محمود حسن، مولانا محمد علی، حکیم محمد اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور دوسرے فدائیانِ قوم نے بویا تھا اور جس کی تخم ریزی میں ہماری جنگِ آزادی کے سپہ سالار اعظم مہاتما گاندھی کی مساعی شامل تھیں وہ آج ایک تناور اور سایہ دار درخت کی صورت میں موجود ہے اور برابر ارتقا کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ یہ کیسا خوش گوار اتفاق ہے کہ ۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے ساتھیوں نے عہد کیا تھا کہ وہ کم سے کم بیس برس تک جامعہ کی خدمت انجام دیں گے اور ۱۵۰ روپے ماہوار سے زیادہ مشاہرہ نہیں لیں گے۔ ابھی یہ عہد پورا ہونے میں ایک برس باقی تھا کہ ہندوستان کی سرزمین پر آزادی کا سورج طلوع ہو گیا۔ خدا نے ان کے عہد کی لاج رکھ لی اور جمہوری حکومت کے قیام نے جامعہ کی مالی مشکلات کا مداوا کر دیا۔ شری راجا گوپال اچاری نے (جو اس وقت عارضی حکومت میں وزیر تعلیم تھے) جامعہ کی جوبلی کے موقع پر ۱۹۴۶ء میں قومی حکومت کی طرف سے ساٹھ لاکھ روپے کے گراں قدر عطیے کا اعلان کیا اور مولانا ابوالکلام آزاد نے (جنھیں آزاد ہندوستان کا پہلا وزیر تعلیم ہونا تھا) ارشاد فرمایا، "جامعہ ملیہ پر زندگی کے ابتدائی پچیس برس گزر گئے۔ اب وہ زندگی کے ایک نئے دور میں داخل ہو رہی ہے۔ ان گزرے ہوئے پچیس برسوں کی مدت طرح طرح کی مشکلوں اور رکاوٹوں کی ایک مسلسل داستان تھی۔ مگر اب وقت آگیا ہے کہ کامرانیوں اور سربراہیوں کی ایک نئی داستان شروع ہو جائے۔ آج ہم اس کا پہلا ورق الٹ رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ نئی داستان زیادہ سے زیادہ کامیاب اور شاندار ہوگی۔" مولانا کا یہ ارشاد بالکل بجا تھا۔ جامعہ کی مشکلیں اور رکاوٹیں ہندوستان کی غلامی کا پرتو تھیں، حصولِ آزادی کے بعد اس صورت حال میں تبدیلی لازمی تھی جو ہو کر رہی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ ہماری تحریکِ آزادی کے ایک خاص رخ یعنی ترکِ موالات کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی، اس لیے قدرتی طور پر شروع میں اس کی زمامِ کار سیاسی رہنماؤں کے ہاتھ میں رہی۔ بعد میں جب ڈاکٹر ذاکر حسین جرمنی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ہندوستان واپس آئے اور شیخ الجامعہ مقرر ہوئے تو انھوں نے محسوس کیا کہ تعلیم کا سیاست کے تابع رہنا تعلیمی مقاصد کے لیے مفید نہیں ہے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ انھوں نے اسے سیاست سے آزاد کرا کے نو بہ نو تعلیمی تجربات کا محل بنایا، اگرچہ اس کے لیے سرمایے کی فراہمی اب بھی سیاسی رہنماؤں کی ذمہ داری تھی۔ اس سلسلے میں سب سے قیمتی خدمات حکیم اجمل خاں صاحب نے انجام دیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، عبدالمجید خواجہ صاحب اور بعض دوسرے حضرات نے بھی فراہمی سرمایہ کے لیے کافی تگ و دو فرمائی۔ جامعہ کی مالی امداد کرنے اور اس سے دلچسپی لینے والوں میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے۔ ہندوؤں میں سیٹھ جمنا لال بجاج خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جو جامعہ کے پہلے خازن بھی تھے۔ ۱۹۲۷ء میں حکیم صاحب مرحوم کی وفات کے بعد جامعہ کی مالی حالت بہت خراب ہو گئی اور سیاسی رہنماؤں کی نیک خواہشات کے باوجود اس میں بہتری نہیں ہو سکی۔ بالآخر ایک وقت آیا کہ جامعہ کی امناء ([illegible]) کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ "کام چلنے والا نہیں ہے۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے، اسے بند کر دو۔" اس وقت ذاکر صاحب اور ان کے معدودے چند

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا